اسلامی اجتماعیت

مقصد اجتماع دنیا کا ہر منظم اجتماع اپنا کوئی نہ کوئی متعین مقصد رکھتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ متعین مقاصد ہی اجتماعیتوں اور تنظیموں کو وجود میں لایا کرتے ہیں، اس لئے کوئی اجتماعیت بجائے خود مطلوب نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کا صرف ذریعہ ہوا کرتی ہے، اور اس کی جو قدر و اہمیت بھی ہوتی ہے اسی مقصد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اگر کسی تنظیم سے، پیش نظر مقصد کا حاصل ہونا صحیح معنوں میں متوقع ہو، تب تو اسے جو قدر و اہمیت بھی دی جائے کم ہے۔ لیکن صورتِ حال اگر یہ نہ ہو تو، چاہے یہ تنظیم سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی کیوں نہ ہو، ایک حقیر تنکے کے برابر بھی قیمت نہ پا سکے گی۔

یہ بات اگر دوسری تمام اجتماعیتوں اور تنظیموں کے بارے میں ایک مسلمہ حقیقت ہے تو اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کے سلسلے میں محض ایک خیال بن کر نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے معاملہ میں اس بدیہی اور مسلمہ اصولی حقیقت سے اختلاف کیا جا سکے۔ اس لئے عقل کہتی ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو جس اجتماعیت، جس وحدت اور جس تنظیم کی ہدایت فرمائی ہے (۱)، سے مراد مطلق اجتماعیت، بے قید وحدت اور

تنظیم برائے تنظیم ہرگز نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ لازماً ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت، ایک خاص طرز کی وحدت، اور ایک بامقصد تنظیم ہی ہو گی، یقیناً کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہو گا جس کی خاطر ہی لوگوں کو متحد اور منظم زندگی بسر کرنے کا یہ حکم دیا گیا ہے، نیز یہی مقصد وہ چیز ہو گی جو مسلمانوں کی کسی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ اسلامی اجتماعیت اور تنظیم ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس مقصد کے حاصل ہونے کا واقعی ذریعہ بن سکتی ہو تب تو اسے اسلامی اجتماعیت، اور اللہ و رسولؐ کی پسندیدہ تنظیم قرار پانے کا حق ہو گا، اور دینی حیثیت سے وہ اس اہمیت کی مالک ضرور تسلیم کی جائے گی جس کی نشاندہی پچھلے اور آنے والے صفحات کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقتِ واقعی اگر یہ نہ ہوئی، اور مسلمانوں کا یہ تنظیمی قافلہ اس مقصد کی طرف بڑھتا دکھائی نہ دیا تو اسے اسلامی اجتماعیت کہلانے کا کوئی حق نہ ہو گا، نہ اسے ان احکامِ دین کی پیروی سمجھا جائے گا جو ملّی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں دئے گئے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھا ہوا ہو، مسلمانوں کی یہ تنظیم اپنے بنیادی فلسفے اور اپنے فطری مزاج ہی کے اعتبار سے کچھ ایسی واقع ہوئی کہ اس سے اُلٹی اسلامی اجتماعیت کے اصل مقصد کی راہ رندھتی ہو، اور اس کے ثمرات اس مقصد کے بجائے کسی اور ہی کی متاعِ مطلوب بنتے ہوں تو یہ اگرچہ 'مسلمانوں' کی تنظیم ہو گی، مگر اسلام کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ ہو گی، اور اس کے بارے میں اس کی خواہش صرف یہ ہو گی کہ اسے توڑ دیا جائے، اس کی موجودہ بنیادیں ڈھا دی جائیں، اور اس کی جگہ وہ تنظیم بپا کی جائے جس سے اس کا مقصدِ اجتماع پورا ہوتا ہو۔

وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے اسلام نے اپنے پیروؤں کو منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے؟ یہ سوال در اصل یہ سوال ہے کہ خود ان پیروانِ اسلام کا بحیثیت

ایک ملت کے، مقصد وجود اور فریضہ منصبی کیا ہے؟ کیونکہ کسی ملت کا مقصد وجود یا فریضہ منصبی ہی وہ چیز ہوتی ہے جس کے لئے وہ ملت بنتی اور ایک متحد و منظم گروہ کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اس لئے ملت اسلامیہ کا مقصد وجود اور فریضۂ منصبی معلوم کر لیجئے، اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کا مقصد واضح ہو جائے گا۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں مختلف مواقع پر جو کچھ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (بقرہ)	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بہتر امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں پر (حق کے) شاہد رہو۔
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)	تم ایک بہترین امت ہو، جسے دوسرے سارے انسانوں کے لئے برپا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ (شوریٰ)	اس نے تمہارے لئے وہ دین مقرر فرمایا ہے جس کی تلقین اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی (اے محمدؐ!) ہم نے تم پر کی ہے... (اس ہدایت کے ساتھ) کہ تم اس دین کو قائم کرو۔

یہ تینوں چیزیں شہادتِ حق[1]، امر بالمعروف و نہی عن المنکر[2] اور اقامتِ دین[3] دراصل ایک ہی معنی و حقیقت کے ترجمان ہیں، اور ان کا یہ لفظی اختلاف اسی ایک معنی کے تین خاص رخوں کو نمایاں کرنے کے لئے ہے۔

قرآن حکیم کے ان بیانوں سے بالکل واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ وہ فریضہ یا مقصد، جس کے لئے مسلمان اس زمین پر ایک جماعت کی حیثیت سے موجود، اور ایک امت کی حیثیت سے مامور ہیں، اللہ کے دین کی اقامت اور شہادت ہے۔ اس لئے انہی بیانوں سے بالواسطہ یہ بات بھی واضح ہورہی کہ اسلامی اجتماعیت کا مقصد اقامتِ دین، امر بالمعروف اور شہادتِ حق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی وہ مراد و مطلوب ہے جس کی خاطر مسلمانوں کو ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی اتنی تاکیدی ہدایتیں دی گئی ہیں، اور ان کے اندر اس منظم اجتماعیت کے شعور کو زندہ و بیدار رکھنے کے لئے اتنے غیر معمولی اہتمامات کئے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان کسی اور غرض سے ہرگز جمع نہیں ہوسکتے، کوئی اور مقصد انھیں اکٹھا کرنے کا حق بالکل نہیں رکھتا، کسی اور مہم کی خاطر ان کی تنظیم حرکت میں آہی نہیں سکتی۔ جس طرح یہ اسلامی زندگی نہیں بلکہ جاہلی زندگی ہے کہ مسلمان منتشر اور بن سری فوج بنی رہیں، اسی طرح یہ بھی سرتاسر جاہلیت ہی ہے کہ وہ دینِ حق کی علم برداری کے سوا کسی اور غرض سے متحد و منظم ہوں۔ اس لئے ان کی کوئی اجتماعیت اور تنظیم اس مقصد سے جس قدر متعلق اور قریب ہوگی، بس اسی قدر وہ اسلامی ہوگی، اور جس قدر اس سے دور اور بے تعلق ہوگی اس قدر لازماً وہ غیر اسلامی ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر اس کی یہ دوری اور بے تعلقی بنیادی اور فطری قسم کی ہوئی تو وہ یکسر غیر اسلامی اور خالص جاہلی اجتماعیت ہوگی، وہ اہلِ ایمان کی کافرانہ تنظیم ہوگی، وہ ایک ایسی جماعت ہوگی جس کے اوپر خدا کا ہاتھ ہرگز نہ ہوگا۔

شیرازۂ اجتماع اسلامی اجتماعیت کے مقصد کا یہ تعین اس کے شیرازے کا بھی تعین کردیتا ہے۔ اگر اس اجتماعیت کا مقصدِ وحید صرف اللہ کے دین کی اقامت اور شہادت ہے، تو یہ اس بات کا بھی فیصلہ ہے کہ اس اجتماع کا مرکز

صرف یہی دین، اور صرف یہ دین ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو ایک متحد و منظم گروہ بن کر رہنے کی ہدایت دیتے وقت جو الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ یہ ہیں:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران)	تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور ٹولیوں میں نہ بٹے رہو۔

یہ ارشادِ ربانی جس طرح اس باب میں بالکل صریح ہے کہ سارے مسلمانوں کو باہم جڑا ہوا رہنا چاہیئے، اسی طرح اس بارے میں کچھ کم صریح نہیں ہے کہ ان کو جوڑنے والی چیز صرف "اللہ کی رسی" ہو۔ معلوم ہوا کہ قرآن نے اہلِ ایمان کو جس متحد و منظم اجتماعیت کا حکم دیا تھا اس کے لئے ناگزیر ٹھیرایا تھا کہ اس کی ہر اکائی اپنے "کل" سے صرف اللہ کی کتاب کے رشتے سے، اور محض اس کے دین کی خاطر آکر ملی اور جڑی ہو۔ اس کے سوا اس "کل" کو "کل" بنانے والا، اور اس کے اجزاء کو آپس میں جوڑنے والا کوئی اور رشتہ نہ ہو۔

ہدایت الٰہی کے اس متن کی شرح معلوم کرنا چاہیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل دیکھیں۔ یہ عمل، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر جانتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ آپؐ نے لوگوں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا، آخرت یاد دلائی، اور ایک خدا کی بندگی کی دعوت دی۔ پوری زندگی یہی کرتے رہے۔ جو اس دعوت کو مان لیتا، وہ اسلامی جماعت و اجتماعیت کا رکن بن جاتا، خواہ اس کی نسلیت، اس کی وطنیت، اس کی رنگت اور اس کی زبان کچھ بھی ہوتی۔ اور جو اسے نہ مانتا وہ اس جماعت کے قریب بھی نہ پھٹک پاتا، چاہے وہ قریشی اور ہاشمی ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس طرح اس دعوت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جس کی طرف آپ نے کبھی کسی کو بلایا ہو، اسی طرح اس رشتے

کے سوا اور کوئی رشتہ بھی نہ تھا جس کے ذریعے کسی کو 'اُمت مسلمہ' سے آ جُڑنے کی آپ نے کوئی گنجائش رکھی ہو۔ ایسی کسی گنجائش کا کیا سوال، آپؐ نے تو اس طرح کی اجتماعیتوں اور جتھہ بندیوں کے خلاف انتہائی سخت الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ 'الجماعۃ' یعنی صحیح اسلامی اجتماعیت سے پوری طرح وابستہ رہنے کی تلقین کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ	اور جس نے 'جاہلیت' کی پکار پر لوگوں
فَهُوَ مِنْ جُثَی جَهَنَّمَ وَإِنْ صَامَ	کو بلایا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اگرچہ
وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ۔	روزے رکھتا، نمازیں پڑھتا اور اپنے

(احمد و ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الامارۃ) آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔

'جاہلیت' کے معنی ہیں اسلام کی ضد ــ یہ اتنی ہی واضح حقیقت ہے جتنی یہ بات کہ شرک، توحید کی ضد ہے۔ اس لئے ہر وہ پکار 'جاہلیت' کی پکار ہوگی جو اسلامی نہ ہو، جس کو قرآن حق کی پکار نہ تسلیم کرتا ہو، جسے رسولِ خدا کی زبان سے کبھی بلند ہوتے نہ سُنا گیا ہو، اور جسے اللہ کے دین میں جواز کی سند حاصل نہ ہو۔ اسلام نے ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے، اور غیر جماعتی زندگی سے سخت بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص لوگوں کو اس اجتماعی نظم سے آزادی اختیار کر لینے کی طرف بُلاتا ہے تو یہ ایک کھُلا ہوا جاہلی بلاوا ہوگا۔ اسی طرح قرآن نے تمام مسلمانوں کو 'اللہ کی رسی' کے شیرازے سے منسلک ہو رہنے کی وصیت فرمائی ہے۔ لہٰذا اگر اس کے بجائے کسی اور رشتے کو مرکز بنا کر انھیں اکھٹے ہونے کی دعوت دی جائے گی تو یہ قطعاً ایک جاہلی دعوت ہوگی، خواہ وہ خون کا، وطن کا، زبان کا، رنگ کا، غرض کوئی سا بھی رشتہ ہو۔ اس لئے حدیث رسولؐ میں جو دہشت بھری تنبیہ فرمائی گئی ہے، قدرتی طور پر اس کا دائرۂ اطلاق

بہت وسیع ہے، اتنا ہی وسیع جتنا کہ 'جاہلیت' کا دائرہ وسیع ہے، اور اس دائرے میں جہاں دوسری چیزیں داخل ہیں وہاں یہ بات بھی داخل ہی ہے، اور شاید سب سے نمایاں طور پر داخل ہے، کہ مسلمانوں کو کسی ایسے 'کلمے' پر جمع ہونے کی، کسی ایسے رشتے سے آبندھنے کی، اور کسی ایسے مرکز پر اکٹھے ہو جانے کی دعوت دی جائے جو اسلامی نہ ہو یعنی اسلام نے اسے نوعِ انسانی کے درمیان امتیاز کی کوئی بنیادی اور حقیقی وجہ نہ تسلیم کیا ہو۔

ایک اور موقع پر اسی حقیقت کے سمجھانے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ	نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے لوگوں
(ابو داؤد، کتاب الادب)	کو کسی 'عصبیت' کی طرف بلایا۔

'کسی عصبیت کی طرف بلایا' یعنی اسلام کی خالص عقلی اور اعتقادی بنائے اجتماع کو چھوڑ کر مسلمانوں کو ان نسلی یا وطنی، لسانی یا لونی تعصبات میں سے کسی تعصب پر جمع کرنے کی کوشش کی جن پر خدا فراموش اور مادیت کی غلام قومیں بالعموم جمع ہوا کرتی ہیں۔

یہ ارشاد نبویؐ بھی اس امر کی واضح شہادت ہے کہ اسلام اور کسی عصبیت کی طرف دعوت، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔

غرض جاہلی پکار اور عصبیتی دعوت، ایک نجاست ہے، اور اسلام کا ذوق لطیف اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ اغوائے شیطانی کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے اس طرح کی کوئی بات نکل گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوری نوٹس لیا، اور ذہنوں کو اس گندگی کے اثر سے پاک کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر ایک مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کی پشت پر لات مار دی۔ انصاری نے "يَا لَلْاَنْصَارِ" (دوڑو اے انصار!!) کی صدائے فریاد بلند کی۔ جواب میں مہاجر نے بھی "يَا لَلْمُهَاجِرِيْنَ" (پہنچو اے مہاجرو!)

کا نعرہ لگایا۔ آپؐ کے کانوں تک یہ الفاظ پہنچے تو فرمایا:

مَا بَالُ دَعْوَی جَاهِلِيَّةٍ؟ دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ۔ (یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی؟ دور رہو اس سے، کیونکہ یہ بڑی گندی چیز ہے)

(بخاری جلد دوم، کتاب التفسیر)

ظاہر ہے کہ "یَا لَلْاَنْصَارِ" اور "یَا لَلْمُهَاجِرِیْنَ" کے الفاظ، جو دراصل نسلی اور وطنی نعرے تھے، صرف ایک وقتی جھگڑے کے سلسلے میں زبانوں سے اچانک نکل آئے تھے۔ کسی سوچے سمجھے فلسفے اور نظریئے کے تحت کسی مستقل جماعت سازی کی دعوت نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی رسولِ خدا کو یہ الفاظ اتنے ناگوار گزرے گویا یہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ غلاظت کے ٹکڑے اور عفونت کے بھبکے ہیں، جنھیں کسی مسلمان کے منہ سے ہرگز نہ نکلنا چاہیئے، اور جنھیں ایمانی ذوق کی پاکیزگی ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتی۔

اگر "جاہلیت" اور "عصبیت" کی طرف بلانے والے کا وجود، اسلامی معاشرے کے لئے 'بالکل ہیچ' ہے اور وہ 'جہنم کا ایندھن' ہے تو وہ شخص بھی، جو اس کے بلاوے پر لبیک کہتا ہے، ملّت کا سرمایہ اور جنّت کا مہمان نہیں بن سکتا۔ عقل اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی بھی وہی حیثیت ہو جو اس جاہلیت اور عصبیت کے داعی کی بتائی گئی ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے جہاں "لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ" فرمایا ہے، وہیں اس فیصلے کا بھی اعلان کر دیا ہے کہ:

وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ۔ (اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کے تحت جنگ کی، اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کی خاطر جان دی۔)

غرض دین کے سوا، دنیا کا کوئی مفاد، کوئی تعلق، کوئی اشتراک اور کوئی رشتہ ایسا نہیں جس پر مسلمان بحیثیت مسلمان اکٹھے ہو سکتے ہوں، اور جو اسلامی اجتماعیت کا شیرازہ بن سکتا ہو۔ ایسی کسی چیز پر اگر مسلمان اکٹھے ہوں تو اس اجتماع کو جو چاہے کہہ لیجئے، لیکن اسلامی اجتماع ہرگز نہ کہہ سکیں گے۔ مذکورہ بالا نصوص سے یہ حقیقت آئینہ کی طرح صاف ہو جاتی ہے۔

طریقِ اجتماع

اب اس بحث کا صرف ایک گوشہ اور باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عملاً یہ اجتماعیت وجود میں کس طرح آتی ہے؟ ویسے تو گذشتہ دونوں امور کی وضاحت کے بعد اس سوال کا جواب معلوم کر لینے کے لئے قیاس اور اندازہ بھی بالکل کافی ہے، مگر مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر مناسب یہی ہوگا کہ اس بارے میں بھی دین کی صریح ہدایتوں ہی پر اپنے اطمینان کی بنیاد رکھی جائے، نہ کہ صرف قیاس اور اندازے پر۔ اس غرض کے لئے جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ اس نے سورۂ آل عمران میں مسلمانوں کو ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی جو جامع ہدایت دی ہے اس کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔	اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو، اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے اطاعت گذار ہو۔

اس کے بعد "اور، کہہ کر" اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑے رہنے" کی وہ بات فرمائی گئی ہے جس کا حوالہ پچھلی بحث میں ابھی گذر چکا ہے۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ ان لفظوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس ہدایت کی پہلی شق ہے، اور بعد کے لفظوں میں

اس کی جو دوسری شق ارشاد ہوئی ہے اس کا وجود اس پہلی کے وجود پر منحصر ہے یعنی جس طرح اسلامی اجتماعیت ظہور میں نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کا دین ہی اس کا شیرازہ نہ ہو، اسی طرح دین مسلمانوں کی اجتماعیت کا شیرازہ ہرگز نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ فی الواقع ایمان والے نہ ہوں، تقویٰ ان کے سینوں میں گھر نہ کئے ہو، اور اسلام (اللہ کی اطاعت گذاری) میں وہ سرگرم عمل نہ ہوں ۔ اس اجتماعیت کا جزو بننے، جزو بنانے اور جزو باقی رہنے کی یہ، اور صرف یہی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اس جماعت کا رکن بننے کا اہل نہیں ہو سکتا، نہ اسے اس کا رکن بنایا جا سکتا ہے۔ جس شخص کے اندر یہ صفتیں جتنی ہی پختہ ہوں گی وہ اس جماعت کا اتنا ہی اچھا اور قابلِ اعتماد جزو ہوگا، اور اسی قدر زیادہ صحیح طریقے سے اس کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ اور جو ان باتوں میں جتنا ہی خام ہوگا جماعت کے ساتھ اس کی وابستگی بھی اتنی ہی ناپائیدار اور ناقابلِ اعتماد ہوگی۔

پھر اس امر واقعی کا تقاضا جس طرح یہ ہے کہ صرف انہی لوگوں کو اس جماعت کا رکن مانا جائے جو اللہ کے دین پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی پیروی کا عہد کریں، اسی طرح اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے رکن بن چکے ہوں ان کے اندر ان صفات کے پروان چڑھانے اور پروان چڑھاتے رہنے کا پورا پورا اہتمام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی جس ہدایت کا ہم اس وقت جائزہ لے رہے ہیں وہ صرف اتنے ہی لفظوں پر ختم نہیں ہوگئی ہے، جن کے حوالے اوپر آچکے ہیں، بلکہ آگے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ :

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	اور چاہیئے کہ تم میں وہ گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلاتا، نیکی کا حکم دیتا اور

وَ یَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ   بُرائی سے روکتا رہے

یہ دراصل اس ہدایت کی تیسری اور آخری شق ہے، جو ایک پہلو سے پہلی شق کا تکملہ بھی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ 'حبل اللہ' کے مرکز پر اکٹھے ہونے سے اہل ایمان کی جو جماعت وجود میں آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرے کے باہر بھی اور اس کے اندر بھی، 'خیر کی دعوت دیتی رہے' 'معروف کا امر' کرتی رہے، اور جہاں بھی ایمان، اسلام اور تقویٰ کے تقاضوں کو پامال ہوتے دیکھے، روک بن کر، سامنے کھڑی ہو جائے۔ صرف اسی شکل میں اس بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ اس جماعت کے افراد اُن صفتوں کے فی الواقع حامل باقی رہیں گے جن کا پایا جانا اس جماعت کی رکنیت کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں سے ایک فرض تزکیہ بھی تھا، اور آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح اس بات کے ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیں اور جو افراد اسے قبول کرلیں اُنھیں اللہ کی آیتیں سُنائیں، 'کتاب' (احکامِ الٰہی) کی تعلیم دیں، اور 'حکمت'، (روحِ دین) سکھائیں، (یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ) اسی طرح اس بات کے بھی ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ اس دعوت کے قبول کر لینے والوں کے علم اور عمل اور اخلاق میں جو خامیاں پائیں ان کی اصلاح کرتے رہیں، (وَیُزَکِّیۡھِمۡ، بقرہ) جو کچھ آپؐ کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا، ممکن نہیں کہ آپؐ کا عمل ذرہ برابر بھی اس سے مختلف ہوتا۔ چنانچہ تاریخ کی پیشانی پر ہر شخص اِس اُبھری ہوئی حقیقت کو نمایاں دیکھ رہا ہے کہ 'امت مسلمہ' کی تشکیل کے سلسلے میں آپؐ نہ تو اس سے کم کسی بات پر راضی ہوئے، نہ اس سے

زیادہ کسی چیز کے طالب بنے۔ آپؐ اللہ کے بندوں کو اسی کی بندگی کی طرف بلاتے۔ جو لوگ اِس دعوت پر لبیک کہتے صرف انہی کو امت کا جزو بناتے۔ اور جن لوگوں کو امت کا جزو بنا چکتے انھیں اپنے دامنِ تربیت میں لے لیتے۔ یعنی ان کے اندر ایمان، اسلام اور تقویٰ کا جوہر پروان چڑھاتے رہتے۔ یہی سب کا سب وہ کارِ نبوت تھا جس کے نتیجے میں اسلامی اجتماعیت اور امتِ مسلمہ وجود میں آسکی۔